© rasailojaraid.com

رسائل و مسائل

اسلام اور جمہوریت پر سوالات

(۲)

سوال:-

جمہوریت کو مغربی نظامِ سیاست کی بنیاد کہا جاتا ہے اور جمہوریت کا اصل الاصول یہ ہے کہ مملکت کے تمام امور اکثریت کی رائے سے طے ہوں یعنی جمہوریت اکثریت کو اس امر کے فیصلے کا غیر مشروط اور لامحدود اختیار دیتی ہے کہ حق کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ کیا آپ اس اصل الاصول کو اسلامی ریاست کے مقصد، منشا اور مزاج کے مطابق قرار دیتے ہیں۔

جواب:-

جی نہیں! کوئی بھی ریاست جو خدا کی حاکمیت کی بنیاد پر قائم نہ ہو اور جس میں آخری فیصلے کا انحصار قانونِ الٰہی پر نہ ہو، وہ اسلامی ریاست نہیں ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ صحیح اسلامی اساسیات پر جو ریاست استوار ہو اس میں حاکمیت الٰہی کے دائرے میں اور قانونِ شریعت کے تحت اکثریت ہی کی رائے سے فیصلے ہونے چاہئیں، ورنہ کئی طرح کے بگاڑ پیدا ہوں گے۔

سوال:-

قرآن مجید اور حدیث رسولؐ نے جو اسلامی قانون کے بنیادی ماخذ ہیں، کسی مستقل نظامِ سیاست و حکومت کو اپنانا مسلمانوں کے لیے لازمی قرار نہیں دیا۔ لہٰذا بہت سے علماء منکرین جمہوریت کو اسلامی ریاست کے لیے قابل قبول قرار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسے مدبر و مفکر بھی ہیں جو اس تصور کو قابلِ قبول قرار دیتے ہیں۔ آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب:

میرے نزدیک اسلام کے اصولِ حکمرانی معین ہیں۔ بنیادی دستوری اصول مقرر ہیں، البتہ سیاسی مشینری اور ڈھانچے کو حسبِ حال ادلا بدلا جا سکتا ہے۔ اور نئی شکلیں بھی ایجاد کی جا سکتی ہیں جمہوریت کی بحث بجائے خود ایک الگ بحث ہے۔ اسلام جس مساوات و اخوت کا نقیب ہے، سیاست میں اس کا نتیجہ کسی نہ کسی طرح کی جمہوریت ہی کی صورت میں نکلتا ہے۔ مگر مغربی جمہوریت اصول و اساس کے اعتبار سے اسلام سے تضاد رکھتی ہے۔ اصول و اساس بدل دیں تو ڈھانچہ کام دے سکتا ہے۔

سوال:

مغربی نظامِ سیاست نے اکثریت کی رائے معلوم کرنے کے لیے ہر بالغ شہری کو رائے دہی کا یکساں حق دیا ہے۔ گویا ایک عالم، ایک بے علم، ایک ماہر اور ایک غیر ماہر ایک نیکوکار اور غلط کار کی رائے یکساں اہمیت رکھتی ہے۔ کیا آپ اس مشروط بالغ حق رائے دہی کو اسلامی ریاست کے لیے قابلِ قبول قرار دیتے ہیں۔

جواب:

بالکل غیر مشروط بالغ رائے دہی تو آج بھی کہیں نہیں ہے۔ البتہ فرق و امتیاز کسی اسلامی اساس پر نہیں ہے۔ آپ کوئی دوسری مناسب کسوٹیاں مقرر کر سکتے ہیں اور پابندیاں لگا سکتے ہیں۔

مگر سوال میں دو باتیں گڈمڈ ہیں۔ ایک ہے رائے عام اور ووٹر کی تربیت کا کام جو افراد، جماعتوں اداروں، تعلیم گاہوں، اخبارات، خطبات مساجد اور حکومتی وسائل سے مسلسل ہوتے رہنا چاہیے۔ خاص طور پر دینی گروہوں اور سیاسی پارٹیوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کی تربیت کریں۔ دوسری چیز ہے ادارات اور قانون کے ذریعے جبری امتیازات قائم کرکے انہیں منوانا۔ یہ ہتھیار صرف چند اہم اور ناگزیر صورتوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے، جیسے کسی کے سابق مجرم ہونے، کسی دوسری صورت میں سزا یافتہ ہونے اور بعض فرائض کا تارک یا محرمات کا مرتکب ہونے کی صورت میں کچھ دوٹوک سے عام اصول بن جائیں۔ بقیہ امور میں آپ کو حضرت امام ابوحنیفہؒ کی اس گراں بہا تحقیق سے باخبر ہونا چاہیے کہ عدالتوں اور قانونی اداروں اور سیاسی ہیئتوں کے سامنے اعلیٰ سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اعلیٰ عالم و متقی اور ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان (جب تک وہ مسلمان ہے) کا مرتبہ یکساں ہوگا۔ مدعی حضرت علی ہوں اور بیٹے یا غلام کے علاوہ کوئی گواہ پیش نہ کر سکیں تو اُن کا ایمانی مرتبہ اور مقامِ علم و تقویٰ عدالت سے اُن کے حق میں فیصلہ نہیں دلوا سکے گا۔ یہی حال تمام اجتماعی ادارات کا ہے۔[۱] یہ تصور عجیب و غریب سا ہے کہ آیا ایک ایک فرد کی زندگی کے ہر پہلو کے متعلق اتنی تفصیلات جمع کی جا سکتی ہیں کہ اُسے آپ کے پیش نظر معیارِ علم و تقویٰ کے لحاظ سے برتر تسلیم کیا جائے۔ کون لوگ سرٹیفکیٹ دیں گے؟ کیا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کی رشوت نہیں دی جا سکتی؟ تعلقات اور سفارشوں کا دخل نہیں ہو سکتا؟ پھر کیا ہر گریجویٹ کو قابل و ماہر سمجھا جائے گا اور ہر مصلی و صائم کو متقی ——— خواہ اس کا تصورِ دین بنیادی ہی سے صوفیانہ ہو؟ کون ایک ایک فرد کے متعلق گواہی دے گا کہ آیا فی نفسہٖ اس کا تصورِ دین و تقویٰ درست ہے اور یہ اُسی کے مطابق سرگرم عمل بھی ہے؟ اور پھر کیا ہر ووٹر کے ووٹ کی قدر و قیمت بھی کارڈ پر درج ہوگی کہ اس کا ا ووٹ مساوی ہے ۳ا ووٹوں کے، یا ۸۰ ووٹوں کے؟

سیدھی سی بات ہے کہ قانون صرف موٹی موٹی شرائط و تحدیدات لگا سکتا ہے۔ بقیہ سارا کام ان قوتوں کو کرنا ہے جن کی ذمہ داری تربیتِ عوام ہے۔ اگر رائے عامہ کی تربیت کرنے والے موجود نہ ہوں، یا کمزور ہوں، یا اُن کی محنتوں کے باوجود عوام کی ذہنی و اخلاقی تعمیر نہ کی جا سکے تو پھر سمجھنا چاہیے کہ ایک قوم اپنی مرضی سے تباہی کی طرف جانا چاہتی ہے۔ موقع ملے تو اُسے جبریت کے ذریعہ اُس وقت تک روکیے، جب تک کہ اُسے روکا جا سکے۔ اور جبریت کے لیے یہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ

[۱] کیا یہ سوچا جا سکتا ہے کہ ڈرائیونگ لائسنس، پاسپورٹ، راشن کارڈ یا ایکسپورٹ امپورٹ لائسنس، یا سرکاری انتظام سے تقسیم ہونے والے پلاٹ یا مکان یا دکانیں صرف متقی افراد کو ملا کریں، یا جو لوگ بھی ثابت کر دیں کہ وہ ایمان و علم و تقویٰ میں دوسروں سے برتر ہیں۔ اور مختلف سرکاری عہدوں اور نوکریوں اور راشن ڈپوؤں وغیرہ کے معاملے تو اور بھی اہم ہوئے، بلکہ کل کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہوائی جہاز کے ٹکٹ اور گاڑی کی ریزرویشن بھی ترجیحاً نیک لوگوں کو ملنی چاہیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہاں تک اسلامی ہے۔ یہ تو ایسا ہے کہ "ترکستان جانے والے کے آگے کوئی حساس اور قوی شخص آکر کھڑا ہو گیا کہ ادھر نہیں جانا ہے، کعبے کی طرف جانا ہے۔ یہ وقتی تدبیر ہے، اصل علاج نہیں۔ اصل علاج تعلیمِ عوام اور تربیّتِ عوام ہے۔ مَیں نے تبلیغ کا لفظ اس لیے استعمال نہیں کیا کہ اس کا مفہوم سکڑ کر ایک خاص شکل اختیار کر گیا ہے۔ آج جو لوگ اس قسم کی بحثیں اُٹھا رہے ہیں، تربیتِ عوام کی اصل ذمہ داری سے بیشتر فرار کردہ عناصر ہیں۔ مدتوں سے یہ اصل کام چھوڑ چکے ہیں۔ لہٰذا اب اُن کی سوچ بچار یہی کچھ ہے کہ اگر کوئی صاحبِ عصا مردے از غیب ایسا نمودار ہو جائے جس کو اسلام سے کسی شکل میں دلبستگی ہو تو بس وہ معاشرے کو کوٹ پیٹ کر اسلامی بنا دے۔ یہ شکست خوردہ ذہنیت ہمارے ہاں دُور دُور تک پائی جاتی ہے۔ اگر کوئی سچّا داعیٔ اسلام موجود ہو تو وہ خوب سمجھتا ہے کہ اگر خدا پرستی، توحید، محبتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حکمتِ قرآن کی نورانیت کی دعوت دے کر لوگوں پر اثر ڈالا جا سکتا ہے تو معیارِ قیادت اور انتخابات کے لیے بھی مناسب تربیت دی جا سکتی ہے۔

مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں کا تصوّرِ تقویٰ ایک حد تک بگڑا ہوا ہے۔ ذاتی طور پر مَیں ہر نمازی کو قابلِ احترام سمجھتا ہوں، لیکن معاشرے کے عوام بلکہ ذہین عناصر کا بھی خیال یہ ہے کہ جب متقی لوگوں کی بات کی جاتی ہے تو ہر نمازی، ہر ڈاڑھی والا، ہر امام مسجد، ہر مؤذن، ہر مدرّس اور ہر واعظ اس گروہ میں آتا ہے، جب کہ اپنے علم و مطالعہ اور اپنے عملی رویّے اور معاملات اور اجتماعی نصب العین کی محبت کے لحاظ سے اس گروہ سے باہر کے کئی لوگ کمتر نہیں ہیں۔ مگر وہ تقویٰ کی "فارم" کو پورا نہیں کرتے۔ اس طرح بہت سے لوگ مُھیّا کریسی اور ملّا کریسی کے کابوس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر ہم مروجہ اصطلاح کے لحاظ سے تمام متقیوں کو چُن کر حکومت کے مناصب تک لے جائیں تو چند دنوں میں اسلامی نظام کے حسین خواب کے پرزے اُڑ جائیں گے، کیونکہ امام اور واعظ تو کجا، ہر مفسر اور محدّث تک کو نظامِ حکومت اور عملی سیاست اور جدید دَور کے مسائل اور اُن کے مختلف اچھے اور بُرے حل معلوم نہیں، ہیں تو ماہرانہ حد تک تو بالکل نہیں۔

پس اس وقت اگر کام چل سکتا ہے تو متقی کی اصطلاح کے معروف مفہوم کو تبدیل کر کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسے ایسی شکل دینی ہوگی کہ ایک طرف اس کے دائرے میں ایسے جدید تعلیم یافتہ اور ماہرِ امورِ سیاست و معیشت داخل ہو سکیں جو ایمانی اور مقصدی اور اخلاقی لحاظ سے اگر بہت اعلیٰ مقام پر نہیں تو کم سے کم بقدرِ ضرورت قدر و قیمت رکھتے ہوں۔ دوسری طرف ایسے علماء یا مذہبی طبقوں کے افراد کو لیا جا سکتا ہے جو جدید مسائل اور سیاسی احوال و ظروف کے متعلق بصیرت رکھنے کے ساتھ ایسے کشادہ ظرف بھی ہوں کہ وہ تھوڑے بہت اختلافات رکھنے والوں کے ساتھ مل کے چل سکیں۔ اہمیت ہمیں ان شخصیتوں کو دینی چاہیے جو بیک وقت دونوں طرح کی ماہرانہ واقفیت کے ساتھ اچھا کردار رکھتے ہوں۔ ایسے ہی لوگ اس دَور میں حکومت چلا سکیں گے اور ایسے لوگوں میں ہمیں ایمان و اسلام کی اساسیات کے ساتھ جن دو چیزوں کو دیکھنا چاہیے وہ ہیں بصیرت اور امانت۔ اور ایسے مردانِ کار کی چھانٹ پرکھ معاشرے ہی سے کرانی ہوگی تاکہ وہ نئی قیادت کا احترام کرے اور اُن کی اتھارٹی تسلیم کرے۔

عملی تدبیرِ اصلاح کے طور پر میں اس گفتگو کے آخر میں یہ رائے دیتا ہوں کہ امیدوارانِ انتخاب (یا نامزد نمائندوں) کے لیے آپ نسبتاً سخت اور واضح معیار رکھیے۔ اس تھوڑی تعداد کی چھنٹائی زیادہ آسان ہے۔ بعد ازاں آپ کابینہ یا صدر یا وزیر اعظم کے لیے تدریجاً مزید اور معیارات رکھ سکتے ہیں۔ یہی بہترین قابلِ عمل طریقِ اصلاح ہے۔

سوال:-

اگر آپ مغربی نظامِ سیاست کو اسلامی اُصولوں سے ہم آہنگ نہیں سمجھتے تو آپ کی رائے میں اسلامی نظامِ سیاست کے خدوخال کیا ہونے چاہییں؟

جواب:-

برادرِ من! مصیبت یہ ہوئی کہ دَورِ رحمت و خلافت میں تو تحریک کے اُبھارے ہوئے لیڈر بغیر کسی غیر معمولی اہتمام کے برسرِ اقتدار آتے رہے۔ بعد میں ملوکیت آگئی اور یہ ہیئت سیاسیہ اسلامی نہیں تھی۔ اس کے تحت رہتے ہوئے جن مصنّفین نے علم السیاست پر لکھا، انہوں نے بھی فقط امیر اور ارکانِ شوریٰ کے اوصاف کی فہرستیں بنانے پر اکتفا کیا۔ کسی ماہر نے اسلامی نظامِ حکومت کے لیے کوئی مشینری نہیں سوچی۔ نتیجہ یہ کہ آج تک کے علمائے دین کے پاس وہی اوصاف کا پیمانہ ہے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مشینری کا کوئی تصور نہیں۔ علمی وفکری لحاظ سے یہ ہماری بڑی فرومائیگی ہے۔

میرے نزدیک نہایت سنجیدہ فضا میں جمع ہونے والے انتہائی دیانت دار ۳۱ علماء کا اجماع (۱۹۵۱ء) ہی ایک ایسا خاکہ دیتا ہے جس پر موجودہ دور میں کام کیا جا سکتا ہے۔ (ان علماء کا خاکہ جن اصولوں پر مبنی ہے وہ اسی شمارے میں دیے جا رہے ہیں)

ہاں! تجربات کے بعد، آگے چل کر مزید بہتری پیدا کی جا سکتی ہو تو کی جائے۔ کام چلانے کے لیے بہت اچھا بلیو پرنٹ ہمارے پاس موجود ہے۔

سوال:- مغربی جمہوریت نے ہر بالغ شہری کو رائے دہی کا حق دیا ہے۔ اسلام میں ووٹر کے لیے بھی تقویٰ معیار ہے۔ وضاحت فرمائیں۔

جواب:-

میرا جواب اوپر کے معروضات سے بھی اخذ کیا جا سکتا ہے، مزید یہ کہ میں اس کے لیے ۵۱ء کے اجماعِ علماء کے ۲۲ اصولوں ہی کی طرف توجہ دلاؤں گا۔

آپ تمام شہریوں کو (یا اُن کی بھاری اکثریت کو) یہ کہہ کر امورِ حکومت وسیاست سے الگ نہیں رکھ سکتے کہ تم چونکہ جاہل اور غیر متقی ہو، لہٰذا تمہیں رائے دینے کا حق نہیں۔ آخر حکومت انہی پر چلائی جاتی ہے اور انہی کے تعاون سے چل سکتی ہے۔ یہ کام اُن کو اعتماد میں لیے بغیر ممکن نہیں۔

۔ آج آبادی کی وہ نوعیت ________________

نہیں کہ تھوڑے سے افراد ہوں اور ہر علاقے اور ہر قبیلے میں فرد فرد کے احوال پر پوری نظر ہو، یہاں تو ۸ کروڑ آبادی کا ہجوم ہے۔ اِن کے بالغ افراد کی رایوں، معمولات، رجحانات کی تربیت کرنا اور اُن کو سمجھنا آسان نہیں ہے، تاہم اِن کو دورِ جدید کے اُن نظریاتی فتنوں سے بچا سکتے ہیں جو پریس اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے سے بارش کی طرح ہر آن برستے ہیں۔ پھر اگر یہ بگڑ جائیں اور کہیں شورش اٹھا دیں تو آج معاملہ اس حد تک محدود نہیں ہے، جس حد تک سیدنا حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں تھا کہ تحریکِ ارتداد اور مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف آپ نے قوت کی کمی کے باوجود پورا معرکہ لڑا، اور ان منفی شورشوں کی سرکوبی کر دی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہر حال میرے نزدیک ارکانِ شوریٰ کا چناؤ ہونا چاہیے اور اس چناؤ کے لیے دنیا بھر کے تجربات کو سامنے رکھ کر اُن کے غلط پہلوؤں کو ساقط کر دیا جائے اور صحیح پہلوؤں کو لے لیا جائے، جو بھی صورت ہو، ارکانِ شوریٰ کا انتخاب ہونا چاہیے —— اور انتخاب بھی انتخاب عام!

سوال:۔

مغربی نظامِ سیاست میں سیاسی جماعتوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور حزبِ اختلاف کا وجود اس نظام کو کامیابی سے چلانے کے لیے ضروری ہے۔ آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب:۔

میں مدت العمر سے سیاسی پارٹیوں کے وجود کے حق میں ہوں، کیونکہ یہ بکھرے ہوئے افراد کو منظم کرنے، اُن کو دینی شعور اور سیاسی تربیت دینے کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ میرے نزدیک پارٹیاں اگر مخالفت برائے مخالفت کے اُصول پر منظم نہ کی جائیں تو وحدتِ ملت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ پارٹیاں شعور و وحدت کو بڑھانے میں مدد دیتی ہیں۔ خود مسلم لیگ نے ہندوستانی مسلمانوں کو جو خاص طرح کا شعور دلایا تھا، کیا وہ پارٹی نہ ہونے کی صورت میں بھی پھیل جاتا۔ اور لوگوں میں منظم تحریک پیدا ہو جاتی؟

پارٹیاں اس لحاظ سے بھی ضروری ہیں کہ وہ عام شہریوں کو بے جا شورش پسندی اور تخریب اور انتشار کے خطرات سے بچا کر اُن کی سرگرمیوں کو آئینی راستوں پر ڈالتی ہیں۔ تخریب پسند اور ہنگامہ خیز پارٹیوں کو میں سیاسی پارٹیوں کی حیثیت میں زیرِ غور نہیں لا رہا۔

اس مسئلے پر میں چونکہ تفصیل سے جون کے اشارات میں لکھ چکا ہوں، اس وجہ سے ساری باتیں دوہرانا مشکل ہے۔

سوال:۔

مغربی نظامِ سیاست میں انتظامیہ اور مقننہ کا دائرہ الگ الگ ہوتا ہے۔ کیا انتظامیہ اور مقننہ کی یہ تفریق اسلامی نظامِ سیاست کے لیے ضروری ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جواب :-

جی ہاں ! اگر آپ اپنی ابتدائی تاریخ کا مطالعہ کریں تو خلیفہ اول کے دور میں یہ واقعہ آپ کے سامنے آئے گا کہ انہوں نے ایک شخص کو جاگیر کا عطا نامہ لکھ دیا۔ پھر وہ حضرت عمرؓ (اُس دور کے عدلیہ کے سربراہ) کے سامنے توثیق کے لیے پیش ہوا۔ انہوں نے حضرت کے عطا نامے کو درست نہ سمجھتے ہوئے اُسے کالعدم قرار دے دیا۔ وہ شخص پھر خلیفہ کے پاس گیا۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کے فیصلے کو برقرار رکھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ شان بھی اور تھی، اور شروع میں کام بھی محدود تھا۔ اور معاشرہ نہایت صالح اور اطاعت گزار۔ بعد میں رجسٹر بنے، دیوان بنے، دفتر کھلے، قید خانے بنے، عدلیہ کا شعبہ مستقل حیثیت اختیار کر گیا۔ آپ ذرا "قضا اور ادب القاضی" کے ابواب احادیث اور فقہی لٹریچر میں نکال کر دیکھیں۔

سوال :-

مغربی نظامِ سیاست میں سربراہ مملکت کا انتخاب براہ راست بھی ہوتا ہے اور بالواسطہ بھی۔ آپ کیا طریق کار تجویز کریں گے؟

جواب :-

میرے نزدیک کسی بھی طریقے کو ضروری اصلاحات اور احتیاطوں کے ساتھ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ضروری یہ ہے کہ پیشِ نظر ملک اور معاشرے کو دیکھا جائے کہ اس کے حالات میں کونسی صورت آسان اور بہتر رہے گی۔

سوال :-

مغربی نظامِ سیاست ایک معینہ مدت کے بعد، حکومت اور مجالس قانون ساز کا دوبارہ انتخاب ضروری قرار دیتا ہے۔ خلفائے راشدین اور عصر حاضر سے پہلے، اسلامی تاریخ کے دوسرے ادوار میں ہمیں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

جواب :- بعد کے دور کی مثال کو تو اصولی فیصلوں کی کسوٹی نہیں بنایا جا سکتا، خود خلفائے راشدین کے ہاں ایسی کوئی اصولی بات نہیں ملتی ہے کہ جو شخص مقرر ہو وہ لازماً مدت العمر کے لیے مقرر ہو، نہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوئی نص (کتاب وسنت میں) ایسی ہے کہ کسی امیر یا رکن شوریٰ کو دائمی طور پر جمے رہنا چاہیے۔

"دائمی امارت" کے تصور کو خواہ مخواہ کا اسلامی اصول بنا کر اس پر فتوے دینا کوئی صحیح صورت نہیں۔

حرفِ آخر!

ان مسائل پر بعض اطراف سے فتووں کے مزاج کی تحریریں آ رہی ہیں۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان سوالوں کو حکمتِ اجتماعیات (SOCIALOGY) کی روشنی میں رکھ کر دیکھا جائے اور اجتماعیات کے بدلتے ہوئے احوال وظروف کو سمجھا جائے۔ احتیاط بس یہ کرنی چاہیے کہ نصوص سے انحراف یا تجاوز نہ ہونے پائے۔ سیاسی ہیئت کے معاملے میں نصوص صرف "حدودِ اربعہ" کے سے نشان لگاتی ہیں، ان نشانات کے اندر مباحات کا بڑا دائرہ سوچ بچار کے لیے موجود ہے۔ اس دائرے کو خواہ مخواہ تنگ کرنے سے پیچیدگیاں بڑھتی جائیں گی۔ (ن۔ص)

© rasailojaraid.com